Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 4, Issue 2
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com

نعمان نذیر

اسکالر پی ایچ-ڈی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

ڈاکٹر نادیہ راحیل

اسسٹنٹ پروفیسر وفاقی اردو یونیورسٹی، کراچی

مابعد جدیدیت کا تصور مقامیت: خالد فتح محمد کے ناول "کوہِ گراں" کے تناظر میں

Noman Nazir

Scholar Ph.D International Islamic University Islamabad

Dr.Nadia Raheel

Assistant Professor, Federal Urdu University, Karachi

Concept Of Localization In Khalid Fateh Mohammad's Novel Koh-E-Graan In The Post Modern Perspective

A major change in the novelists of the 21st century is that they show an intellectual retreat towards their local cultures. Novelists deviated towards their locale. Khalid Fateh Muhammad belongs to Gujranwala district of central Punjab. He drew attention to the serious problem of water scarcity in Koh-i-Garan. Due to the drying up of Chenab river, the region is facing water scarcity which may intensify in the coming years. In the narrative of the novel, all the colors of the life of central Punjab are present with full magnificence. In the novel, various social concepts are also described in addition to customs and relationships.

Key Words: Locale, water scarcity, postmodernism, intensity, narrative.

کلیدی الفاظ: فکری و شعوری، فکشن، ثقافت، تہذیب

ناول کی صنف میں ترقی کے ساتھ ساتھ ناول نگاروں کے موضوعات میں تنوع کا سلسلہ اکیسویں صدی میں مزید وسیع ہو گیا۔ اکیسویں صدی میں ناول نگاری کے ضمن میں خالد فتح محمد کا نام بھی ایک نمایاں اضافہ ہے۔ جدید ناول نگاری میں متواتر ناول لکھنے والوں میں ان کا شمار ہوتا ہے۔

اکیسویں صدی کے کئی ناول نگاروں کے ہاں اپنے مقامی عناصر کا بیان ملتا ہے۔ اس صدی کے ناول نگاروں نے اپنے لوکیل کی طرف مراجعت کی۔ فکری و شعوری طور پہ اپنی مقامی ثقافت کو ہی اظہار خیال کا وسیلہ بنایا۔ وہ اپنے ماضی/مقامی ناطے کی طرف لوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول نگاروں نے بڑے شہروں کی ثقافتوں کو اپنانے کے باوجود جب قلم اٹھایا تو ان کے قلم سے اس بڑی ثقافت کی ترجمانی کے بجائے اپنے ماضی کی طرف شعوری انحراف کیا اور اس کے بیانیے میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

کوہِ گراں میں گوجرانولہ اور سیالکوٹ کے علاقے کا بیان ہے۔ دریائے چناب کے پانی کو ہندوستان کی جانب سے روکے جانے کے اس سے متاثر علاقے کا بیان ہے۔ پانی اس دور کا اہم مسلہ بنتا جا رہا ہے۔ ناول نگار نے پانی کی قلت کے نازک مسئلے کو اپنے فکشن میں بیان کیا ہے۔ ناول میں مستنصر حسین تارڑ کے ناول بہاؤ کا بھی خیال آتا ہے جہاں پانی کی قلت نے ایک جیتی جاگتی تہذیب کو مٹا دیا۔ پاروشنی اس کی بقا کی خاطر اسی تہذیب کو زندہ رکھنے کے جتن میں اپنی جان دیتی ہے۔ کوہ گراں میں ایسی بے چارگی نہیں بلکہ بقا کی عملی کوشش بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس تہذیب کے نمائندے اپنے ورثے کو قائم رکھنے کی خاطر اپنے علاقے میں ہی رہ جاتے ہیں اور باقی زندگی کی بقا کی جنگ لڑتے لڑتے ان علاقوں کی حدود سے دور چلے جاتے ہیں۔ پانی تہذیبوں کے بسنے اور اجڑنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

حلیم ناول کا مرکزی کردار ہے۔ حلیم کا تعلق گاؤں کے اونچے طبقے گھرانے سے ہے۔ وہ روایتی چودھریوں کی طرح ایسے خاندان کا چشم وچراغ تھا جو شہر جا کر اچھی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ان کے خدمات گاروں کی ایک کثیر تعداد ان کی آبائی زمینوں میں سے سونا اگلوا کر ان کی چودھراہٹ کو پردیس میں بھی برقرار رکھنے کا باعث بنتی ہے۔ حلیم نے اپنی زندگی شہر کے آرام وآسائش میں گزاری اور اس کی نئی نسل اس زندگی کا مستقل حصہ بن گئی۔ حلیم کی عمر ساٹھ سال سے زیادہ ہے۔ وہ اپنی عمر میں ہے جب شہر کی زندگی میں اس کی کوئی خاص اہمیت نہ رہی۔اور نہ ہی بظاہر اب اس کے پاس وہ طاقت اور صلاحیت ہے کہ وہ کوئی نامکمل کام کر سکے۔ حلیم کی اچانک اپنے آبائی گاؤں میں ڈرامائی واپسی ہوتی ہے۔ایسی صورت حال میں جب اسے یہ بھی یقین نہیں کہ اس کے گاؤں میں کسی جاندار کی زندگی کے آثار بھی موجود ہیں یا نہیں۔ وہ اپنی سب آسائشیں مال ومتاع حتکہ اپنی گھڑی اور موبائیل فون تک کو بھی اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ وہ جس مقام کے لئے سب کچھ چھوڑ آتا ہے وہ ایک صحرائی اجڑا ہوا گاؤں جہاں محض ریت، بھر بھری مٹی، مکانات کے کھنڈرا اور ان کھنڈروں میں موجود ایک جیتی جاگتی زندگی کے آثار کے بجائے ایک سناٹا اور خوف کی علامت موجود ہے۔اظہر حسین حلیم کے کردار کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ :

"کوہ گراں کا حلیم نہایت زیرک اور مصمم ارادے کا حامل کردار ثابت ہوتا ہے۔ اس ضمیر کا متحرک اور اس میں اپنے گاؤں کے لئے کچھ کر دینے کی لگن اور خواہش اسے خود انگیخت (Self –motivation)

کرتی ہے اور وہ اہم کام میں لگ جاتا ہے۔"(1)

گاؤں میں ایسے زندگی کے وجود کے ساتھ پہلا شخص مراد علی ملتا ہے جو تپ دق کے مرض میں اپنی سانوں کی الٹی گنتی پوری کر رہا ہے۔ حلیم کے لئے یہ نیم مردہ شخص بھی کسی نعمت سے کم نہ تھا کم از کم اسے زندگی کی ایک صورت تو نظر آئی۔ یہ ہی وہ زندگی کا احساس تھا جو انسان کو زندگی کے ہونے کی امید دلاتا ہے۔ مراد علی زرا توقف کے بعد اپنے چھوٹے چوہدری کو پہچان لیتا ہے دونوں جلد ہی ماضی کے گمشدہ مرغزاروں میں بھٹکتے ہوئے زندگی کے آثار تلاش کرنے لگ جاتے ہیں۔ماضی کے خوشگوار لمحوں میں کھو کہ حال کے اس درد کو رفو کرنے کے جتن بھی ہیں۔ دونوں کے درمیان ماضی کے کئی واقعات کا تبادلہ ہوتا ہے۔ان کے بیان میں وسطی پنجاب کے دیہات کی زندگی پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔ مراد علی کے تعارف کے بیان میں حلیم نے مقامی عناصر کے پہلوؤں کو دیکھا جا سکتا ہے۔

"مراد علی کو ماد و کہتے تھے۔ وہ سیاہ رنگت، مضبوط جسم اور چھوٹے سے قد کا لڑکا ہوا کرتا تھا۔ وہ صبح سے لے کر شام تک پیدل پھرتا رہتا۔ گندم کے پھلے لگے ہیں۔ دھان پٹھا جا رہا ہے۔ کماد کی بیجائی ہو رہی ہے۔ گنے کے رس کے شیرے کو گڑ بنانے کے لیے کڑاہ سے نکالا جا رہا ہے۔ بھینس یا گائے بولی ہوئی ہے۔ کوئی میلہ یا کبڈی کا دنگل ہے۔ماد و وہاں موجود ہوتا۔ وہ ننگے پاؤں پھرتا رہتا اور اس کے پاؤں کے تلوے اتنے سخت ہو گئے تھے کہ کیکر کی سول بھی جلد میں داخل نہیں ہو سکتی تھی اور نہ ہی موسموں کی شدت ان پر اثر کرتی تھی (2)"۔

مراد علی نے ماضی کی عظمت رفتہ کی یادوں کا تذکرہ کیا۔ گویا وہ اس آفت زدہ ماحول میں اپنے پرانے سربراہوں میں سے ایک فرد سے ملنے کا موقع غنیمت جان کر تمام حال بیان کرنا چاہتا تھا اور اس انتظار میں تھا کہ کوئی ان کے سروں پہ شفقت کا ہاتھ رکھے۔ مراد علی نے پرانے واقعات کو اس کے سامنے تازہ کیا اور ماضی کے ساتھ اسے اپنا ہم خیال بنانا چاہا. اس کے بیان میں رسم ورواج، طبقاتی نظام، لوگوں کی ذمہ داریاں، زندگی کے مختلف پہلو چلتے پھرتے دکھائی دیتی ہیں۔

"صبح کو تم سکول چلے جاتے اور ہم جو کمی کمین تھے اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے۔ کوئی ڈھور سنبھال رہا ہے، کوئی چارہ کاٹنے چلا گیا تو کوئی واری والے دن سیراب کرتے پانی کی چوکیداری پر بیٹھ گیا ہر کوئی اپنے جثے اور طاقت کے مطابق کام کرتا تھا۔"(3)

مراد علی کی یاداشت میں محفوظ واقعات حلیم کو ماضی کے اور بھی قریب لے گئے اور ساتھ ہی اسے یہ احساس ہوا کہ وہ جو حقیقی ورثہ اس کے سینے میں پوشیدہ ہے اس کے بعد ساتھ ہی نہ مٹ جائے کیونکہ وہ زندگی کے آخری مرحلے میں تھا۔ مراد علی حلیم کو گاؤں میں موجود دو اور افراد کی موجودگی کی بھی اطلاع دیتا ہے۔ایک کا نام دیسو ہے اور دوسری غیر متوقع طور پہ ایک عورت۔اس کا نام گڈو ہے جو علیم کی معشوقہ کی بیٹی ہے۔ جس کی عمر چالیس سے بیالیس برس کے درمیان ہے۔ مراد علی کے بعد وہ دیسو کے گھر جاتا ہے۔ دیسو ایک اپاہج مرد ہے جو پچاس برس کے قریب ہے۔ جوانی میں ہی اس کا ایک بازو نکارہ ہو گیا تھا۔ حلیم کے پہنچنے پہ وہ اس کی ویسے ہی تعظیم کرتا ہے جیسے کسی وقت میں چودھریوں کی کی جاتی تھی۔ چودھری کا منصب ابھی بھی قائم ہے کیونکہ اس کے عہد کے دو لوگ ابھی بھی اس گاؤں میں موجود ہیں۔

مراد علی کے برعکس دیسو اچھی شہرت کا آدمی نہیں اس کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے ہے اور وہ کسی نہ کسی طور ان کے ساتھ شریک جرم رہتا ہے۔ماضی میں بھی اسی وجہ سے اسے گاؤں بدر کیا گیا لیکن گاؤں اجڑنے کے بعد وہی گاؤں کا رکھوالا بھی بنا۔اور کسی حد تک گاؤں کی تباہی کا ذمہ دار بھی لیکن اس کے ان جرائم میں کسی حد تک اس کی محروم زندگی اور ایسے ویران علاقے میں زندگی کے بقا کی کوکوشش کا بھی دخل ہے تھا۔ مراد علی پانی کا ختم، گاؤں کا اجڑنا اور لوگوں کی نقل مکانی کا بیان کرتا ہے۔ دیسو کا تعلق ابھی بھی کئی قسم کے جرائم پیشہ گروہوں سے تھا اس کے ساتھ ساتھ وہ حلیم کے ماضی سے بھی مکمل طور پہ واقف تھا۔ جس کا اظہار اس نے پہلی ملاقات میں ہی کر لیا۔ان کی گفتگو میں مختلف مقامی عناصر کے بیان کے ساتھ ساتھ طاقت، مراتب، نسبت کی برتری اور اس کے پردے میں چھپے استحصال کا بیان بھی ملتا ہے۔ دیہاتوں میں عموماً ایک معمول کی حثیت رکھتا ہے۔اس طاقت کے زیر اثر پروان چڑھنے والی کمزور عوام کی سوچ بھی اس قدر پستی کا شکار ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے استحصال کی راہ میں رکاوٹ بننے کا تصور تو درکنار اپنے ساتھ ہونے والے استحصال کو بھی بسا اوقات اپنی کامیابی یا اپنے لیے باعث فخر سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اس قدر بے بس کر دیے جاتے ہیں کہ مسئلہ ان کی جانوں کا ہو یا مال کا حتکہ عزت کا ہی کیوں نہ ہو وہ اپنے ان چودھریوں یا نام نہاد مالکوں کے سامنے جمادات کی مانند ہی ہوتے ہیں۔

"چودھری جی، جب فاطمہ کے خاوند نے تمہیں اس کے ساتھ اپنے گھر میں دیکھا تو تمہارے جانے کے بعد اس نے جواب طلبی کی۔" دیسو پھر ہنسنے لگا۔

" جانتے ہو فاطمہ نے کیا جواب دیا؟" حلیم حیرانی سے اور تجسس کے ساتھ دیسو کو دیکھنے لگا۔

اس نے کہا تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ چھوٹا چودھری مجھے ملنے تمہارے گھر آیا۔ ورنہ وہ مجھے اپنے گھر بھی بلا سکتا تھا"۔(4)

حلیم گڈو کے گھر ہی قیام کرتا ہے۔اس مقام کو مرکز بناتے ہوئے وہ اس عزم کا اعادہ کرتا ہے کہ وہ اپنے گاؤں کو پھر سے آباد کرے گا۔ حلیم کے ساتھ محض تین لوگ ہیں جن میں سے ایک مریض دوسرا اپاہج اور تیسری ایک عورت۔ وہ ان تین لوگوں کے ہمراہ ایک بڑے مقصد کو پانے آیا تھا اور وہ مقصد تھا اس علاقے میں کسی طرح پھر سے ہریالی لانے کا مقصد۔ گڈو نے بقول اس کے اپنا گاؤں چھوڑنا قبول نہ کیا اور پھر دیسو جیسے آدمی کی مکاری نے اسے مزید یہاں رہنے پہ مجبور کر دیا جو ان کے کھانے کے انتظام کے ساتھ ساتھ اس روٹی کا ذریعہ بھی ثابت ہوتی تھی۔ گاؤں کی صورت حال یہ ہے کہ چرند پرند تو درکنار جڑی بوٹیاں، گھاس تک نایاب ہیں۔ دیسو دور دراز سے کچھ پانی لے آتا ہے جس کو محض پینے کے لئے یا یوں کہا جائے صرف جینے کی حد تک استعمال کیا جاتا تھا تو بے جا نہ ہو گا۔ چند گھونٹوں کے حساب سے اس کی پیمائش ہوتی تھی۔

اس اجڑے گاؤں میں زندگی آخری سانسوں پہ تھی جس میں کسی نہ کسی طرح یہ تین افراد چلا رہے تھے۔ حلیم کا عزم اسے یہاں کھینچ لایا اور وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح نہر میں پانی آ جائے، یہ زمین آباد ہو جائے اور گاؤں کے مکین واپس لوٹ کر اس گھر کو از سرِ نو آباد کریں۔ یہ ناممکنات میں سے تھا۔ وہ تینوں بھی۔ جلد ہی اس کے ہم خیال ہو جاتے ہیں۔

دیسو کا تعلق قریبی گاؤں کے جرائم پیشہ گروہ کے سربراہ حفیظ عرف حاجی سے تھا۔ جو بچپن میں حلیم کا ہم جماعت رہا۔ دیسو اسے گاؤں لاتا ہے وہ چوہدری حلیم کی مشروط حمایت کا اعلان کرتے ہوئے اس کی مدد کا آغاز کرتا ہے۔ حلیم کو ایک مالی سہارا اور ضرویات زندگی کا سامان مہیا کرنے والا سہارا مل گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اچھی شہرت کا حامل نہیں لیکن اپنے مقصد کے لئے اس کا ہم خیال ہونا ضروری تھا۔ حلیم دن کو اس اجڑے گاؤں کو آباد کرنے کے تخیل میں گم رہتا ہے تو کبھی ماضی میں اس میں دوڑتی زندگی کو سوچتا ہے۔ اس کے ذہن میں گزرے وقت کا تصور مقامی روایات، سماجی بندھن سب کچھ اپنی شناخت کے ساتھ موجود دکھائی دیتا ہے۔ ہر پرانے واقعے میں وہ پرانی ثقافت کو دریافت کرتا ہے ۔ کئی سالوں بعد بھی اس کی یاداشت میں سب کچھ محفوظ ہے وہ اس ماحول سے نکل کے بھی خود کو دور نہ رکھ سکا اس کے ذہن میں تو سب کچھ ویسے ہی تروتازہ ہے۔اسے وہ دن بھی یاد آیا جب اس کے خاندان نے پہلا ٹریلر خریدا تھا۔ لوگوں کے نزدیک اس جدید ذریعے کی کس طرح مخالفت کی۔ جدید سہولیات نے ان کے کاموں کو تو آسان بنایا ساتھ ان میں اجتماعیت بھی ہونے لگی۔انسانی وقار سب سے مقدم تھا۔

"کئی گھنٹے ہل چلانے کے بعد جب ڈرائیور ٹریکٹر کو تھوڑے عرصے کے لیے بند کر کے اس کے تیل اور پانی کی سطح دیکھ رہا تھا تو ہالی وہاں پہنچ جاتے۔ عطا محمد اکیا ہوا؟ تم تھک گئے ہو یا یہ کنجر؟ اگر بیلوں کی جوڑی ہوتی تو تمہیں بھی مزا آتا اور ہمیں بھی۔ جہاں کھڑا ہے وہاں اپنے وزن سے زمین کو برباد کر رہا ہے۔

بیلوں نے گوبر اور پیشاب سے اسی زمین کو زرخیز کرتا تھا۔"(5)

حلیم کے اپنے گھر پہ تالا پڑا ہے جسے دیسو نے اس کی غیر موجودگی میں بھی کسی کو چودھری کے گھر کی حرمت کو پامال کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ دیسو اچانک متحرک ہوتا ہے اور چوہدری کے خواب کی تکمیل میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔اس کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے تھا جو کسی مجبوری یا احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اس راہ پہ چل پڑے تھے۔ وہ قریب کے تین بڑے گرہوں سے ملتا ہے جن کی اس نے کسی نہ کسی وقت میں کسی طرح مدد کی تھی۔ وہ تینوں گروہ اپنے اپنے علاقوں میں اجارہ داری قائم کیے ہوئے ہیں۔ لیکن ان کے تسلط کے

تحت رہنے والا اب کوئی نہیں ان کے علاقے بھی خشک سالی کا شکار ہیں۔ان کے ہاں بھی لوگ جو بچے وہ علاقہ چھوڑ گئے گویا اس پورے خطے کی تہذیب مٹنے کے قریب ہے۔دیسو ان کو وقت کی نزاکت اور اہم مسلے کے مطابق سب کو اس معاملے میں یکجا کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔وہ سب چوہدری کے منصوبے پہ عمل کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔حلیم کے بقول

"اگر ہم نے اپنا گاؤں آباد کر لیا تو تم اپنا گاؤں آباد کر سکو گے۔کوئی اور اپنے گاؤں کو آباد کرنے کا بیڑا اٹھالے گا۔بہار کے بادلوں سے پہلا قطرہ گرنے کی دیر ہوتی ہے۔اس کے بعد جل تھل ہو جاتا ہے۔"(6)

حلیم کا منصوبہ بیراج توڑ کر نہر کو آباد کرنا ہے۔بظاہر وہ ریاست کے خلاف کام کرتا ہے لیکن وہ اسی مٹتی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔حلیم،امین،وارث،بلو اور حفیظ کی مدد سے بیراج توڑنے اور نہر میں پانی لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔وہ سب اس کوشش میں مارے جاتے ہیں ریاست کی طاقت ان کو کچل ڈالتی ہے۔وہ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود اپنے مٹی سے وفاداری نبھاتے ہوئے،اپنی ثقافت اپنے ورثے کو قائم رکھنے کی کوشش میں حلیم کے منصوبے پہ عمل کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں۔ناول نگار نے ان کرداروں کی عیاری اور مکاری کو بھی آخر میں یوں بدل دیا کہ قاری کو ان کے انجام پہ افسوس ہونے لگتا ہے وہ ایک اچھے مقصد کے لیے جان قربان کر دیتے ہیں۔

حلیم کا منصوبہ بیراج توڑ کر نہر کو آباد کرنا ہے۔بظاہر وہ ریاست کے خلاف کام کرتا ہے لیکن وہ اسی مٹتی ہوئی تہذیب کو زندہ کرنا چاہتا ہے۔حلیم،امین،وارث،بلو اور حفیظ کی مدد سے بیراج توڑنے اور نہر میں پانی لانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔وہ سب اس کوشش میں مارے جاتے ہیں ریاست کی طاقت ان کو کچل ڈالتی ہے۔وہ جرائم پیشہ ہونے کے باوجود اپنے مٹی سے وفاداری نبھاتے ہوئے،اپنی ثقافت اپنے ورثے کو قائم رکھنے کی کوشش میں حلیم کے منصوبے پہ عمل کرتے ہوئے جان دے دیتے ہیں۔ناول نگار نے ان کرداروں کی عیاری اور مکاری کو بھی آخر میں یوں بدل دیا کہ قاری کو ان کے انجام پہ افسوس ہونے لگتا ہے وہ ایک اچھے مقصد کے لیے جان قربان کر دیتے ہیں۔

چوہدری حلیم کے کردار کے تناظر میں ناول نگار اپنی مقامیت کی طرف سفر طے کیا ہے ناول نگار کا تعلق وسطی پنجاب کے ضلع گوجرانولہ سے ہے۔اس علاقے کے چند علاقوں کو دریائے چناب سیراب کرتا تھا۔ہندوستان کی طرف سے پانی روکے جانے کے باعث زرخیز زمینوں کو پانی کی قلت کا سامنا کرنا پڑا۔زیر زمین پانی کی سطح بھی ان علاقوں میں مسلسل گزرتی جا رہی ہے۔ناول میں بیان علاقہ بھی یہ ہی ہے۔وسطی پنجابی کے دیہاتوں کی ثقافت ماضی کے پیرائے میں ناول نگار نے پوری آب وتاب کے ساتھ دکھائی ہے۔حلیم اس تہذیب کو مٹنے سے بچانے کی خاطر اس ویران اجڑے ہوئے گاوں میں واپس لوٹ آتا ہے۔اس کے کردار کے بارے میں ڈاکٹر امجد طفیل لکھتے ہیں

"کوہ گراں میں خالد فتح محمد پھر معاشرتی صورت حال خاص طور پر ہمارے عہد میں پانی کی کمیابی کو اپنا موضوع بنایا ہے۔اس ناول کا لوکیل بھی وسطی پنجاب یا واضح الفاظ میں گوجرانولہ اور سیالکوٹ کے اضلاع ہیں۔خوشحالی کا دور گزرنے کو ہے۔مگر ناول کا مرکزی کردار اپنے علاقے کی زرخیزی بچانے کے لئے نہر کھودنے کے مشن پر ہے۔ریاست کی طاقتور مشینری سے ٹکراؤ،ناول میں کافی تناؤ اور دلچسپ صورت حال پیدا کرتا ہے۔"(7)

ناول نگار کے ہاں مقامی بیانیہ موجود ہے۔مابعد جدیدیت بھی مقامی،چھوٹے بیانیے کی بات کرتی ہے۔مابعد جدیدیت کے تناظر میں مقامی پہلوؤں کو مختلف حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔حکیم کے کردار میں خاص پہلو یہ ہے کہ وہ گاؤں کی بحالی بھی چاہتا ہے۔لیکن وہ اس کی از سر نو تعمیر کرنا چاہتا ہے۔وہ فن تعمیر میں بھی خاص ردوبدل چاہتا ہے۔جس میں لائبریری بھی شامل ہے جو وہاں کے لوگوں کی علمی ضروریات کو بھی پورا کرے اور اس کے ساتھ ساتھ مذہبی نمائندگی یعنی مسجد بھی تاکہ مذہبی معاملات بھی طے پا سکیں۔گویا وہ ماضی اور حال میں مکالمہ چاہتا ہے۔اپنی راویت کو برقرار رکھتے ہوئے اسے جدید خطوط پہ استوار کر کے اس تہذیب کو مستحکم کرنا چاہتا ہے۔مابعد جدیدیت بھی ماضی و حال کے درمیان مکالمے کی ہی ایک فضا قائم کر دیتی ہے۔خالد فتح محمد نے ناول کے بیانیے میں بار بار مقامی ثقافتی پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔حتکہ فصلوں کے بیان،خوراک،لباس میں بھی مقامی رنگ موجود ہے۔وہاب اشرفی اس تناظر میں لکھتے ہیں:

"مابعد جدیدیت اس پر اصرار کرتی ہے کی کوئی بھی ادیب اپنی ثقافت کا زائیدہ ہوتا ہے۔جو اپنی مٹی کی خوشبو بھی رکھتا ہے اور اس کے حدود بھی Globalisation کے اس زمانے میں جہاں ادب آفاقی نظر آتا ہے وہاں اس امر کو رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے مضمرات میں اپنے ملک کے حوالے بہر طور موجود ہوتے ہیں۔آداب زندگی،طور طریقے یہاں تک کہ مجلسی زندگی کا انداز بھی اسی کا حصہ ہے جو ہم جیتے رہتے ہیں اور ہماری اپنی مٹی کا خمیر رکھتا ہے۔"(8)

ناول میں مذہبی عقائد بھی شامل ہیں جو اس علاقے کے اپنے مخصوص تصورات ہیں ان تصورات اور عقائد کا تعلق بھی اپنے مخصوص خطے سے ہے جو اپنی انفرادیت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں۔ناول میں جہاں دوسرے ثقافتی عوامل کو بیان کیا گیا وہیں اس حوالے سے مذہبی تصورات جو مقامی ثقافت کے رنگ کے ساتھ جڑے ہوتے ہیں۔ان پہ اس مخصوص

ثقافت کی چھاپ نمایاں ہوتی ہے۔اسی کے زیر اثر یہ عقائد پروان چڑھتے ہیں اس بات سے قطعہ نظر کہ ان میں مذث رنگ نمایاں ہے یا یہ مذہب کے اصل تصور کے مطابق ہیں یا اس کے خلاف لیکن اس خاص عقیدت کو اس کے ساتھ جڑنے والی رسم ورواج کو اس مقامیت مین خاص اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

"حضرت شاہ رحمان نو شاہی قلندری کا سالانہ عرس عقیدت مندوں کے لئے بہت اہمیت کا حامل تھا۔یہاں قوال، صوفیانہ کلام گانے والے، بازار حسن کی گانے والیاں، عوامی اور لوک گائیک، سرکس، تھیٹر، موت کے کنویں، راس ڈالنے والے، ہوٹل، کھانے پینے کی دکانیں، کرتب دکھانے اور جھولوں والے آتے۔یہ سب لڑکوں، ریڑھیوں، تانگوں، بیل گاڑیوں، کاروں میں پہنچ کر اپنے اپنے اڈے اور ٹھکانے قائم کرتے۔عقیدت مند میلہ دیکھنے اور گھومنے والے گھوڑوں, تانگوں، بیل گاڑیوں اور بسوں پر آتے۔"(9)

کوہ گراں اکیسویں صدی کے ناولوں میں سے ان ناولوں میں شامل ہے جو مقامیت کے تصور کے تحت لکھے گئے ہیں۔ناول نگار نے وسطی پنجاب کی دیہی زندگی کو بیان کیا ہے۔ماضی کے واقعات، تذکروں سے مزین اس ناول میں علاقائی ثقافتی، زندگی اپنے رسوم ورواج، توہمات، عقائد کے ساتھ موجود ہے۔زرعی علاقوں میں زمین کی اہمیت مرکزی ہوتی ہے جو تمام لوگوں کو ایک نقطہ پہ جمع رکھتی ہے اس کے ساتھ ساتھ تمام زندگی جڑی ہوتی ہے۔اس کے اجڑنے سے نہ صرف انسان بلکہ پوری تہذیب ہی جامد اور بالآخر مٹ جاتی ہے۔

حوالہ جات

1۔اظہر حسین۔خالد فتح محمد کا فکشن، مشمولہ: سہ ماہی ادبیات، ناول نمبر جلد دوم، اسلام آباد، 2020ء ص134

2۔خالد فتح محمد۔کوہِ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء ص 8

3۔ایضاً۔ص9

4۔ایضاً۔ص32

5۔ایضاً۔ص91

6۔ایضاً۔ص148

7۔ادبیات ناول نمبر جلد دوم، اسلام آباد، 2020ء۔ص96،97

8۔وہاب اشرفی۔مابعد جدیدیت مضمرات وامکانات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، دہلی۔2004ء۔ص245

9۔خالد فتح محمد۔کوہِ گراں، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، 2017ء ص۔15